قرآن کی زبان

—— ❀ ڈاکٹر عبدالخالق، صدر شعبۂ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی

فکر اسلامی کی تاریخ میں جتنے بھی مابعد الطبیعی، دینیاتی اور فقہی اختلافات رونما ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کے لئے خالصتہً نفسیاتی وجوہ کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی ضروریات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تاہم ان اختلافات کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جس کی جانب مسلمان حکماء نے اب تک بہت کم توجہ دی ہے۔ اس پہلو کا تعلق قرآن حکیم کی زبان سے ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہر مدرسۂ فکر اپنے موقف کی تائید میں قرآن و حدیث سے ہی استشہاد کرتا ہے اور اس عمل میں علماء و حکماء کا خلوص نیت بھی اکثر و بیشتر موجود ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایک ہی نوع کی آیات سے الگ الگ بلکہ بعض اوقات متناقض معانی اخذ کر لئے جاتے ہیں ــــ قرآن حادث ہے یا قدیم، انسان آزاد ہے یا مشیتِ ایزدی کا پابند، دیدارِ الٰہی ممکن ہے یا ناممکن، کائنات کی بالارادہ تخلیق کی گئی یا یہ ایک لزوم کیساتھ اللہ تعالیٰ سے صادر ہوئی۔ وغیرہ۔ ان سب مباحث میں مفکرین نے قرآن حکیم اور اقوال رسولؐ سے ہی حوالے پیش کئے ہیں۔ اس ساری صورت حال سے یہ نتیجہ بڑی آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی زبان میں مطالب و مفاہیم کی مختلف تہیں موجود ہیں جن سے ہر فکری سطح اور ہر ذہنی استعداد کے لوگ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ابن رشد نے اسی بات کے پیش نظر مذہب سے متعلق افراد کو تین گروہوں میں تقسیم کیا تھا ــــ فلسفی، متکلمین اور عوام الناس ــــ حقیقت مطلق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے فلسفی برہانی استدلال استعمال کرتے ہیں، متکلمین جدلی استدلال کا سہارا لیتے ہیں جبکہ عوام الناس کے لئے زور خطابت اور شاعرانہ تمثیلات ہی کافی ہوتی ہیں۔ اس موضوع پر حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے بھی کچھ تفصیلات مہیا کی ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ ایک مثبت

فلسفہ مذہب کی بنیاد فراہم ہوتی ہے بلکہ قرآن کے مطالب کی ان سطحوں کا بھی سراغ ملتا ہے جو مختلف ذہنی افتاد رکھنے والے لوگوں کے لئے ہدایت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ مختلف گروہوں کے باہمی تنازعات اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر تکفیر و تکذیب کے لامتناہی سلسلوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے امام غزالیؒ نے کہا کہ یہ سب کچھ دراصل کم علمی کے باعث ہوتا ہے۔ ایمان و تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ نے جن چیزوں کے وجود کی خبر دی ہے ان کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے لیکن وجود کے پانچ مراتب ہیں جن میں سے کوئی درجہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے

اوّل وجود ذاتی

دوم وجود حسی

سوم وجود خیالی

چہارم وجود عقلی

پنجم وجود شبہی

امام غزالیؒ کے نزدیک شریعت میں مذکورہ موجودات کا مطلقاً انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن اگر ان پانچ اقسام میں سے کسی قسم کے مطابق ان کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو یہ کفر نہ ہوگا بلکہ تاویل ہوگی اور تاویل سے کسی شخص اور کسی فرقے کو مفر نہیں۔

یہ قرآن کا یقیناً بہت بڑا اعجاز ہے کہ قرن اول سے لے کر آج کے سائنسی اور تکنیکی دور تک اور ایک سادہ ذہن سے لے کر متمدن اور مہذب ترین شخص تک سب کے لئے یہ برابر طور پر ایک عظیم منبع رشد و ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ قرآنی آیات کے کسی خاص مفہوم کے انتخاب میں اگر انسان کی بدنیتی اور عدم خلوص کا دخل ہو جائے تو سوائے کنفیوژن کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور یہی قرآن اس کے لئے ضلالت و گمراہی کا سبب بن جاتا ہے۔ یُضِلُّ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

خود قرآن ہی کے فیصلے کے مطابق اس سے گمراہی حاصل کرنے والے اکثر لوگ وہ ہیں جو اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کی خاطر متشابہ آیات کی مختلف تاویلات کرتے چلے جاتے ہیں۔ محکم آیات پر تو ان کا بس نہیں چلتا کیونکہ ان کے معانی متعین ہوتے ہیں۔ لیکن متشابہ آیات کے معانی متعین نہیں ہوتے اور مختلف انداز سے ان

کی توجیہہ کی جا سکتی ہے وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے من مانی کارروائی کرنے کا جواز حاصل کر لیتے ہیں۔

لسانی فلسفیوں نے الفاظ کے مطالب کی دو اقسام گنوائی ہیں جنہیں بنیادی اور ثانوی مطالب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بنیادی مطالب سے مراد الفاظ کے لغوی معانی ہیں۔ یہ معانی الفاظ کو Uniqueness of Refrence عطا کرتے ہیں اور یوں انہیں اس قابل بناتے ہیں کہ ابلاغ عامہ کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں لیکن ہر لفظ کا ایک ثقافتی پہلو اور ایک واضح معاشرتی کردار بھی ہوتا ہے۔ روزمرّہ زندگی کی مختلف Situations میں استعمال سے اس میں مفہوم و معنی کے مختلف shades پیدا ہو جاتے ہیں۔ ارتقار کا یہی عمل الفاظ کے ثانوی مطالب کو جنم دیتا ہے۔ قرآن حکیم نے آیات محکمات و متشابہات میں جو فرق کیا ہے اسے الفاظ کے بنیادی اور ثانوی مطالب کے اسی فرق سے متماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے آیات متشابہات وہ آیات ہیں جن میں مفہوم کی مختلف سطحیں موجود ہوتی ہیں اور اسی بنا پر ان سے ہر صورت حال میں رشد و ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

محکمات اور متشابہات کے اس مبیّنہ فرق کے باوجود اگر قرآن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ فرق کوئی مطلق نوعیت کا نہیں ہے۔ ایک مقام پر قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں اور ایک دوسری جگہ اس نے اپنے لئے کِتاباً متشابہاً کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ دونوں موقف درحقیقت باہم دگر متناقض نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا اشارہ معروضی نہیں بلکہ موضوعی صورت حال کی جانب ہے۔ ان کی موزونیت کا انحصار ان افراد کی ذہنی سطح اور افتادِ طبع پر ہے جو مشتملات قرآن کا ادراک حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حسی تجربے اور تحلیلی فکر Analytical Reason کی سطح پر ہو یعنی اس کی سوچ محض مادی حوالوں کی ہی پابند ہو تو اس کے لئے سارا قرآن متشابہات کی حیثیت اختیار کرے گا۔ یہاں تک کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کو ایک مطمح نظر ایک نصب العین یا ایک مثالی قدر سمجھنے لگے گا۔ اس ضمن میں ایک ملک کے قومی علم کی مثال دی جا سکتی ہے۔ دیکھنے میں تو یہ علم صرف کپڑے یا کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے لیکن اس کے اندر ایک نہایت گہری معنویت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے قومی عزت اور

وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ جب اس کو لہرایا جائے تو اُس ملک کے رہنے والے کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور جب اس کی بے حرمتی ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود قومی وقار کو ٹھیس پہنچی ہے۔ اسی طرح اللہ کا لفظ ان اقدار کے متبادل سمجھا جاتا ہے جو ساری نوعِ انسانی کے لئے منتہاء مقصود کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح شیطان کا لفظ تمام برائیوں کی علامت ہے۔ جنّت اور جہنم مکانی حقیقتیں نہیں بلکہ صرف ذہنی حالتوں کے نام ہیں۔ ملائکہ قوانین فطرت ہیں وغیرہ ——— قرآن کی اشاراتی توجیہہ کی اس انداز کی روایت باقاعدہ طور پر معتزلہ سے شروع ہوئی جنہوں نے ذہنِ مجسمہ کے عقائد سے پیدا ہونے والے اشکالات سے بچنے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال اشاریت پسندوں کے نظریات میں جداگانہ نوعیت کی مشکلات موجود ہیں۔ وہ دراصل ایک ایسے مسئلے کو غیر فطری طریق سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو خود ان کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ فطری مشاہدے اور عقلی تجزیے پر کلی انحصار کرتے ہوئے پہلے تو وہ خدا اور کائنات کے درمیان ایک خلیج حائل کر لیتے ہیں اور پھر اسے عبور کرنے کے لئے قیاسات (Analogies) کا سہارا لیتے ہیں۔ اس اسلوب فکر میں بہت سی منطقی قباحتیں موجود ہیں جن کا تفصیلی ذکر اس مختصر سے وقت میں ممکن نہیں۔ البتہ ایک بات نہایت اہم ہے اور وہ یہ کہ قیاسی استدلال فقط ان دو حدود کے مابین استعمال کیا جا سکتا ہے جو بدیہی طور پر پہلے ہی سے معلوم ہوں جبکہ یہاں ایک حد یعنی خدا اور اس کا تمام مافوق الفطری نظام کلیتہً غیر معلوم ہے۔ کیونکہ اس کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہی یہ استدلال استعمال کیا جا رہا ہے۔ اسی اشکال کی بنا پر اشعری مفکرین کے ایک گروہ نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو بلا کیف ولا تشبیہ مان لینا چاہیئے۔ یہ نظریہ اگرچہ منفی نوعیت کا ہے لیکن اسے ایک لحاظ سے خالص عقلی اندازِ فکر کا لازمی اور منطقی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

حسی تجربے کے برعکس اگر کسی شخص کو مذہبی شعور حاصل ہو یا زیادہ معروف اصطلاح میں یوں کہئے کہ اُسے ایمان بالغیب میسّر آ جائے تو اس کے لئے سارا قرآن محکم حیثیت اختیار کر لے گا۔ ایمان بالغیب حق الیقین کے اس مرتبے کا نام ہے جو اقبال کے نزدیک ایک منفرد تجربے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سطح پر تمام مابعد الطبیعی حقائق سے جو کہ بعض آیاتِ قرآنی کا موضوع رہے ہیں اسے براہِ راست آگہی حاصل ہو جائیگی اور وہ اپنے روزمرّہ کے معاملات بھی اسی آگہی کی روشنی میں کرنے لگے گا۔ مشہور حدیث ہے: اتّقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ

اس مقام پر فائز ہوکر اسے فہم قرآن کے لئے کسی قسم کی توجیہ وتاویل کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ ہی کسی نوع کی فکری کاوش یا لسانی تجزیہ درکار ہوتا ہے۔ آیات قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے ان کا مافی الضمیر اس پر بلا واسطہ وارد ہو جاتا ہے۔ اپنے قلب و روح کی گہرائیوں سے وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا قرآن اسی پر نازل ہو رہا ہے اور وہ اللہ سے محو گفتگو ہے۔ مشہور فرانسیسی فلسفی برگسان نے اس قسم کے رویئے کو Intellectual Analysis سے مختلف قرار دیتے ہوئے Intellectual sympathy کا نام دیا ہے۔ چنانچہ قرآن کو سمجھنا ایک مخصوص زاویۂ نگاہ یا نقطہ نظر اختیار کرنے پر منحصر ہے۔ جس طرح کسی سطح زمین کے نشیب و فراز کا ادراک حاصل کرنے کے لئے بلند تر جگہ پر کھڑے ہو کر جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح قرآنی آیات کو سمجھنے کے لئے ہمیں خود خدا کے ساتھ تعلق خاص قائم کر کے اس کی مشیت کو اپنے رویوں کا لازمی حصہ بنا لینا چاہیئے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے قرآن حکیم نے بالعموم کائنات کے حسی مشاہدے اور اس پر فکر و تدبر کی دعوت دی ہے۔ فطرت خدا کی عادات پر مشتمل ہے۔ جس طرح ایک انسان کی معرفت حاصل کرنا اس کی عادات و اطوار کو سمجھ لینے کے مترادف ہے اسی طرح مظاہر فطرت خدا کی ہستی اور اس کی صفات کی جانب بلیغ اشارات مہیا کرتے ہیں۔ ان پر غور و فکر کرنے سے ہی اللہ کی معیت کا وہ احساس اپنے میں دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے جو روز الست ہمارے لاشعور کو ودیعت کر دیا گیا تھا۔

(بقیہ: نقد و نظر)

وہ دیکھ سکتا ہے کہ ان لاکھ روپوں پر جو حصہ اسے مل سکتا ہے وہ کتنے فی صد ہے، اس پر بھی وہ غور کر سکتا ہے کہ کیا ایک لاکھ روپیہ زمین پر لگانا مفید ہوگا یا اگر وہ کوئی اور کاروبار کرے تو اسے اس سے زیادہ شرح منافع حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر کسی دوسرے کاروبار میں منافع زیادہ ہونے کا امکان ہو تو شاید اس کے لئے یہ زیادہ مناسب ہو کہ وہ دوسرا کاروبار کرلے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص اپنے سرمایہ سے کوئی دوسری جائداد وغیرہ خریدے یا اسے کسی دوسرے پیداآور کام میں لگائے اور خود مزارعت پر زمین لیکر محنت کرنے میں اپنا منافع جانے ایسی صورت میں مزارعت کسی مجبوری کا نام نہ ہوگا بلکہ مزارع کے اپنے انتخاب اور اختیار کا — مختصر یہ کہ مزارعت لازماً مجبوری کے طور پر نہیں اپنائی جاتی